مسئلہ عصمت انبیاء علیہم السلام

علامہ اصغر علی روحی

حضرت موسیٰ علیہ السلام

آپ نے اپنے بھائی ہارون علیہم السلام کو عتاب کرتے وقت سر سے پکڑ کر کھینچا۔ جس پر انہوں نے فرمایا۔ یاابن ام لاتاخذ بلحیتی و لابراسی یعنی میرے سر وریش کو مت پکڑ۔ چونکہ ہارون نبی تھے۔ اس لئے آپ کا یہ فعل ایک نبی اللہ کی بے حرمتی پر دلالت کرتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ آیت کے الفاظ صرف یہ ہیں فاخذ براس اخیہ یجرہ الیہ ۔یعنی موسیٰ علیہ السلام نے آپ کو سر سے پکڑ کر کھینچا۔ اس سے ہرگز بالوں سے پکڑ کر کھینچنے کا ذکر نہیں بلکہ موسیٰ علیہ السلام نے غصہ میں آ کر جیسے کہ عتاب کنندگان کا قاعدہ ہے ہارون کو سر سے پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ اور کہا کہ تم نے قوم کی طرف سے کیوں غفلت کی ہارون علیہ السلام نے جب آپ کی غضب کی حالت کا مشاہدہ کیا تو اس خیال پر کہ کہیں عتاب عملی طور پر بصورت ضرب ظاہر نہ ہو۔ فرمایا کہ میرے سر اور ریش کو آپ نہ پکڑیں۔ کیونکہ انہیں حالات کی رو سے یقین ہو گیا تھا۔ کہ شاید سر وریش کے پکڑنے کی نوبت آ پہنچے الفاظ لاتاخذ بلحیتی سے ہرگز یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ کہ درحقیقت موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کی ڈاڑھی پکڑ لی تھی اور آپ کی بے حرمتی کا قصد کیا تھا۔ دیکھو آیہ و لاتطع منھم آثما او کفورا میں جناب پیغمبر علیہ السلام کو ارشاد ہوا کہ آثم اور کفور کی بات کو مت مانو۔ اس آیت سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ جناب پیغمبر علیہ السلام کفار کی اطاعت کیا کرتے تھے۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے ممانعت کی بلکہ محض بطور احتیاط ایسا فرمایا۔ جس سے دین کے بارے میں عوام الناس کو استقلال اور تشدد برتنے کی تعلیم دینا مقصود ہے۔ ایک عام عقل کے آدمی کو جملہ لاتاخذ سے یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ سچ مچ موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کی داڑھی پکڑ لی تھی حالانکہ یہ محض غلط ہے۔ الغرض لاتاخذ صیغہ نہی سے امر ممنوع کا صدور ثابت نہیں ہوتا اور اس قدر سلوک بھی موسیٰ کی طرف سے محض محبت دین پر مبنی تھا۔ جس میں مقصد معصیت کو ہرگز دخل نہیں ہو سکتا سو معترض کا اعتراض محض اس کی عدم تدبیر کا نتیجہ ہے۔

(ب) آپ نے باآنکہ خضر علیہ السلام نے قبل از مصاحبت آپ کو کہہ دیا تھا۔ کہ میرے کسی فعل پر اعتراض نہ

کرنا۔ان کے مختلف افعال پر اعتراض کیا۔حالانکہ قبل از سفر یہ بات بطور معاہدہ قرار پا چکی تھی اور معاہدہ کی خلاف ورزی ایک نبی اللہ کی شان سے بعید ہے۔

جواب یہ ہے کہ آپ کا اعتراض کرنا۔نقض عہد کی نیت سے نہیں تھا۔بلکہ محض بطور نسیان آپ سے ایسا واقع ہوا۔اور نسیان کا انبیاء علیہم السلام سے وقوع میں آنا ان کی عصمت کے ہرگز مانع نہیں جیسا کہ صفحات گزشتہ میں ظاہر کیا جاچکا ہے۔ہاں برخلاف عوام الناس کے انبیاء علیہم السلام کو نسیان پر بھی مواخذہ ضرور ہوتا ہے اور یہی ان کے حق میں بمنزلہ جرم سمجھا جاتا ہے اور موسیٰ علیہ السلام کے مذکورہ بالا اعتراض کی نسبت خود قرآن مجید نے یہ فیصلہ دے دیا ہے کہ محض ان کے نسیان کا نتیجہ تھا۔چنانچہ فرمایا لاتواخذنی بمانسیت یعنی آپ (خضر علیہ السلام) مجھے ایسے امر پر مواخذہ نہ فرمائیں جو بصورت نسیان مجھ سے سرزد ہوا ہے اور موسیٰ علیہ السلام کا معترض ہونا ظاہر حال پر مبنی تھا کیونکہ لڑکے کا مار ڈالنا (گو اس میں عین مصلحت تھی) ایسا سرسری امر نہیں تھا۔کہ آپ چپ رہتے۔اس مقام پر چند ایک اور دلچسپ ابحاث باقی ہیں لیکن ہم انہیں لکھنا پسند نہیں کرتے کیونکہ معارف قرآنیہ کو قلمبند کرنے پر عموماً کم استعداد لوگ چونک پڑا کرتے ہیں۔

(ج) آپ نے فرمایا فعلتھا اذاً وما انا من الضالین یعنی مجھ سے یہ فعل (قبطی کا قتل) بحالت ضلالت سرزد ہوا۔ہے اس سے معلوم ہوا کہ آپ ضلالت میں تھے۔

جواب۔یہ ہے کہ آپ کا مذکورہ بالا فعل قبل از نبوت تھا اور ضلالت سے صرف عدم معرفتِ احکام مراد ہے کیونکہ نزول شریعت سے پہلے اتمام حجت نہیں ہوا کرتا اور جب اتمام حجت نہیں تو آپ کا فعل مذکورہ حد جرم میں بھی داخل نہیں ہوسکتا اور ضلالت بمعنی عدم معرفت احکام عام طور پر مستعمل ہے دیکھو آیہ ووجدک ضالا فھدی میں ضلالت بمعنی عدم معرفت احکام مراد ہے۔کیونکہ قبل از نزول شریعت عدمِ معرفتِ احکام ایک امر واقعی ہے۔ضلالت کے یہ معنی کہ احکام شریعت کے علم ہونے پر کسی حکم کی آپ نے خلاف ورزی کی بالکل باطل ہے۔اس لئے آیہ وانا من الضالین کا یہ مطلب ہوا کہ میں نے ایسی حالت میں فعل مذکور کا ارتکاب کیا کہ از روئے شریعت مجھے اس کے جواز یا عدم جواز کا علم نہیں تھا۔اور یہی معنی ووجدک ضالا فھدی میں ماخوذ ہیں۔یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام احکام شریعت کی معرفت نہیں رکھتے تھے۔اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے آپ پر شریعت نازل فرمائی جس سے آپ کو صراط مستقیم کا پتہ چلا۔چنانچہ ایک دوسرے مقام پر آپ کی نسبت ارشاد ہوتا ہے۔ماکنت تدری مالکتاب ولا الایمان یعنی تو قرآن اور ایمان سے بالکل بے خبر تھا۔

☆اکثر ما یخاف لا یکون، وغالب ما یسمع من مکروہ لا یقع، وفی اللہ کفایۃ وعندہ رعایۃ، ومنہ العون.☆

اس اعتراض کا ایک جواب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ضلالت بمعنے نسیان بھی مستعمل ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ آیہ۔ان تضل احدھما میں ضلالت بمعنے نسیان بھی ہے کیونکہ مطلب یہ ہے کہ اگر ایک عورت کو ادائے شہادت میں نسیان ہوجائے تو دوسری عورت اس کو یاد دلائے چنانچہ فتذکر احدھما الاخری میں ضلالت کے معنے نسیان کی کافی شہادت موجود ہے اور اسی توجیہ کی تائید میں سورۂ یوسف میں آیہ لفی ضللک القدیم موجود ہے۔

(د) آپ نے اللہ تعالی سے سوال کیا۔رب ارنی انظر الیک یعنی خدایا مجھے اپنا آپ دکھا۔حالانکہ جب بنی اسرائیل نے آپ کے سامنے یہی استدعا پیش کی اور کہا ارنا اللہ جھرۃ ۔یعنی اے موسیٰ ہمیں خدا تعالی کو کھلم کھلا دکھادے۔تو ان لوگوں پر صاعقہ کا عذاب نازل ہوا۔اس لئے اس واقع کے ہوچکنے کے بعد آپ کو اللہ تعالی کے حضور میں ایسا سوال پیش نہیں کرنا چاہئے تھا۔

جواب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ان لوگوں کے واقعے سے پہلے تھا۔اس لئے یہ اعتراض عائد نہیں ہوسکتا کہ آپ نے ایسا سوال کیوں پیش کیا۔نیز آپ کا سوال کرنا حصولِ شرف وسعادت کی غرض سے تھا جو تصدیق یقینی کے بعد پیدا ہوا تھا۔جس طرح ابراہیم علیہ السلام کا احیاء موتی کی بابت باوجود تصدیق قدرت کے سوال کرنا۔اور بنی اسرائیل کا سوال بطور طعن وانکار کے تھا۔اور وہ لوگ توحید کی بابت شکوک واوہام میں پڑے ہوئے تھے۔سو ہر دو قسم کے سوال کی نوعیت مختلف ہے۔

یونس علیہ السلام

(الف) وذالنون اذذھب مغاضبا فظن ان لن نقدر علیہ فنادی فی الظلمات ان لاالہ الاانت سبحانک انی کنت من الظالمین سے آپ کے متعلق یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ذالنون یعنی یونس علیہ السلام نے اپنے رب پر اظہار غضب کیا جو نبی اللہ کے ہرگز شایاں نہیں۔

جواب یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیات میں کامل تدبر نہ کرنے کا نتیجہ بجز ایسی غلط فہمیوں کے اور کیا ہوسکتا ہے۔معترض نے نہایت سخافت عقل سے کام لیا ہے اور ایک نبی اللہ کی نسبت جن کی شان میں جناب پیغمبر السلام لاتفضلونی علی یونس ابن متی ۔(مجھے یونس ابن متی پر فضیلت مت دو) ارشاد فرماتے ہیں ۔مذکورہ بالا اعتراض عائد کیا جو نہ صرف گناہ بلکہ کفر صریح ہے۔آیت مذکورہ بالا میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس سے یہ

اشارہ پایا جائے۔کہ آپ نے اپنے رب پر اظہار غضب کیا۔صحیح مطلب اس آیت کا یہ ہے کہ آپ قوم کی سرکشی کی وجہ سے سخت غضب آلود ہوکر نکل گئے۔چونکہ ایک نبی اللہ کوقوم کی اذیت اورنافرمانی پرصبرواستقلال کرنا ضروری ہوتا ہے اس لئے آپ کا غضب میں آکران سے قطع تعلق کر لینا اللہ تعالی کو ناپسند تھا۔چنانچہ آپ کواس بارے میں مواخذہ ہوا اور۲ آپ مچھلی کے پیٹ میں محبوس رہے۔

رہا معترض کا آیہ فظن ان لن نقدر علیه پر یہ اعتراض کہ یونس علیہ السلام نے یہ خیال کرلیا تھا کہ اللہ تعالی ان پرقدرت نہیں پائیگا۔یہ ایک سخت گستاخی اور بے ادبی ہے کلام الہی کی۔اورہتک عظیم ہے نبی اللہ کا کیونکہ اس سے بڑھ کرایک نبی اللہ پر اورکیا بہتان قائم کیا جاسکتا ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالی کواس پر قدرت نہیں ہوگی۔حالانکہ کسی جاہل سے جاہل آدمی بلکہ ضعیف الخلقت عورت کا بھی یہ خیال نہیں ہوسکتا کہ وہ اللہ تعالی کے قبضہ قدرت سے باہر ہے۔

معترض قدر علیه کے معنی جواس مقام پر چسپان تھے نہیں سمجھ سکا۔اورایک ایسے معنی پر جو غیر چسپان تھے......اعتراض کردیا۔اس آیت میں قدر علیه بمعنی ضیق علیه کے واقع ہوا ہے۔

اور یہ معنی قرآن مجید میں کئی ایک مواقع پر مذکور ہیں۔قال الله تعالی و اما اذا مابتله فقدر علیه رزقه ای ضیق علیه اس تفسیر کے رو سے آیت مذکورہ بالا کا مطلب یہ ہوگا۔کہ یونس علیہ السلام نے یہ خیال کرلیا۔کہ ان کی قوم پراس طرح غضب آلود ہونے سے اللہ تعالی ان پرکسی قسم کی گرفت نہیں کریگا۔کیونکہ آپ نے خیال بخیال خود محض حمیت اور غیرت سے ایسا کیا تھا۔

معترض کا مذکورہ بالا بحث کے متعلق ایک یہ اعتراض بھی ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالی جناب پیغمبر علیہ السلام کو یوں خطاب فرماتے ہیں و لا تکن کصاحب الحوت یعنی مچھلی والے یونس علیہ السلام کی طرح مت ہو۔سواس قبول سے بھی یونس علیہ السلام کے برخلاف استدلال ہوسکتا ہے جواب یہ ہے کہ اس آیت کے الفاظ سے صرف اس قدر واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالی جناب پیغمبر علیہ السلام کوقرآن مجید میں باربار صبرواستقلال اوراحتمال اذیت کی تاکید فرماتا ہے۔چنانچہ اس مقام پر بھی وہی تاکید ہے یعنی یونس علیہ السلام کی طرح صبر کو مت چھوڑو اور قوم کی اذیت پر اظہار غضب مت کرو۔

الغرض یونس علیہ السلام کا فعل مذکورہ بالا بخیال خود خیر محض تھا مگر چونکہ اللہ تعالی کو پسند نہیں تھا۔اس لئے خیر محض ہونے کی حیثیت سے وہ گناہ نہ ہوا۔مگر بوجہ خدا تعالی کو ناپسند ہونے کے قابل مواخذہ سمجھا گیا۔کیونکہ انبیاء علیہم

السلام کو اس قسم کے سہو نسیان پر بھی مواخذہ ہوا کرتا ہے۔اور اسی کو ان کے حق میں ظلم معصیت قرار دیا جاتا ہے ۔چنانچہ شروع مضمون میں اس پر پوری بحث ہو چکی ہے۔

داؤد علیہ السلام

معترضین کی طرف سے آپ کے متعلق ایک بہتان عظیم بطور اعتراض کے مشہور ہے جس کو ایک ایماندار کی طرف بھی منسوب کرنا صریح ظلم ہے۔ چہ جائیکہ ایک نبی اللہ صاحب کتاب اور صاحب معجزات اور والیٔ ملک کی نسبت اس کو صحیح تسلیم کیا جائے۔معترضین نے یہود کی پیروی میں صرف اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ اس کو قرآن مجید سے ثابت کرنا چاہا ہے۔

اعتراض یہ ہے کہ آپ اوریا نام ایک ہمسایہ سپاہی کی عورت پر عاشق ہو گئے ۔اور دغا اور فریب سے اس کو مرواڈالا اور اس کی بیوی کو اپنی بیویوں میں جن کی تعداد ننانوے تھی شامل کر لیا۔آپ مسجد میں تھے کہ خدا تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ مدعی اور مدعا علیہ کی وضع میں آپ کے پاس جائیں اور اپنے جھگڑے کا آپ سے فیصلہ لیں۔جھگڑے کی صورت یہ تھی کہ مدعی نے کہا کہ میری ایک بھیڑ تھی اور اس شخص نے جس کے پاس ننانوے بھیڑیں تھیں زبردستی چھین کر اپنے ریوڑ میں شامل کر لیا اور اس پر قابض ہو گیا ہے۔جب فرشتوں نے جو آدمیوں کی شکل میں پیش ہوئے۔اپنے مقدمہ کی کیفیت آپ کے سامنے پیش کی ۔تو آپ کو جھٹ اپنا واقعہ یاد آ گیا۔اور آپ سمجھ گئے کہ خدا تعالیٰ کو میرا فعل ناگوار تھا جس پر بطور تنبیہ کے مجھے مدعی اور مدعا علیہ کے واقع سے نادم کیا گیا ہے پھر آپ نے اللہ تعالیٰ سے طلب مغفرت کی جس پر آپ کا گناہ معاف ہوا۔معترضین اہل کتاب اس واقعہ کو قرآن مجید کی آیات ۳ سورہ ص سے مطابقت دیا کرتے ہیں جواب یہ ہے کہ مذکورہ بالا قصہ جھوٹ ہے جس کی کوئی اصل نہیں۔یہود اہل کتاب کی افترا پردازیوں کا یہ ایک ادنیٰ سا نمونہ ہے۔کیونکہ ان کے ہاں دیگر انبیاء علیہم السلام کے متعلق بھی اسی قسم کی غلط روایات مروی ہیں۔افسوس کہ بعض مصنفین اسلام نے بھی ایسے زبان زد عام قصوں کو کہیں کہیں اخذ کر لیا ہے۔مگر علم روایت کے بڑے بڑے اکابر ائمہ نے روایات کی خوب چھان بین کر کے کتاب اللہ کو ایسے اکاذیب سے بالکل پاک وصاف ثابت کیا ہے۔وھوالحق.....اصل واقعہ صرف اسی قدر ہے کہ چند آدمی مل کر آپ کی خدمت میں مذکورہ بالا جھگڑے کی بابت فیصلہ لینے کو حاضر ہوئے۔اور وہ لوگ فی الحقیقت معاملہ مذکورہ بالا کی بابت باہم نزاع کرتے تھے۔یہ بالکل غلط ہے کہ

فرشتوں نے آدمی کی شکل میں آ کر بطور تمثیل کے ایک جھگڑا آپ کے سامنے پیش کیا جس سے آپ اپنے واقعہ پر مطلع ہو کر توبہ واستغفار کرنے لگے اور معترض کا آیہ **وظن داؤد انما فتناه..... الخ فغفرنا له ذلک** سے اپنے اعتراض کی تائید کرنا بالکل باطل ہے۔ کیونکہ ان ہر دو آیات کا صرف یہ مطلب ہے کہ داؤد علیہ السلام نے خیال کیا کہ یہ ملک وحکومت جواللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے عنایت ہوئی ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے لئے ابتلا وامتحان ہو جس پر اللہ تعالیٰ کی جناب میں بار بار التجا کرتے تھے۔ کہ خدایا اس ملک ودولت سے میرا امتحان نہ کیجو۔ اور مجھے اپنی اطاعت ورضا کے مرکز پر قائم رکھیو۔ چونکہ مجھ کو دولت کا عطا ہونا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور ابتلا کے نہ تھا بلکہ محض عنایت ازلی تھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کے اس ظن کو آپ کے حق میں گناہ جانا۔ چنانچہ اس بنا پر آپ کو مغفرت نصیب ہوئی۔ کیونکہ ایسا ظن درحقیقت ایک قسم کا سوءظن تھا۔ جو ایک نبی اللہ کی شان سے بعید ہے۔ الغرض الفاظ قرآن مجید سے ہرگز مذکورہ بالا بہتان کا اشارہ نہیں پایا جاتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرمایا کرتے۔ **من حدث بحديث داؤد علی مایرویه القصاص جلد ته مائة وستين** یعنی جو شخص داؤد کا واقعہ اس طریق پر بیان کریگا جو عام قصہ خوانوں میں مشہور ہے تو میں اسے ایک سو ساٹھ تازیانوں کی سزا دونگا۔ جو انبیاء علیہ السلام پر بہتان قائم کرنے کی سزا ہے

سلیمان علیہ السلام

معترضین آیہ **انی اجبت حب الخیر عن ذکر ربی حتی تورات بالحجاب** سے آپ کی نسبت یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ آپ ایک دن اپنے اصطبل کے گھوڑوں کا معائنہ کر رہے تھے اور اس کام میں اس قدر مستغرق ہو گئے کہ آفتاب غروب ہو گیا اور عصر کی نماز فوت ہو گئی جس پر آپ نے غضب میں آ کر گھوڑوں کی گردنیں اور پنڈلیاں کٹوا دیں۔ جس کا اشارہ آیہ **ردوها الی فطفق مسحا بالسوق والاعناق** میں کیا گیا ہے جواب یہ ہے کہ یہ روائیت ازسرتاپا غلط ہے جو بعض زنادقہ یہود کی تراشی ہوئی ہے۔

کتاب اللہ اور سنت صحیحہ سے ہرگز اس واقع کی تصدیق نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایک نبی ومرسل کا نماز جیسے ضروری فرض سے ایسی حالت میں غفلت کرنا کہ کوئی شرعی عذر نہ ہو محال عقلی ہے جس کے امکان کا تجیر ایک جاہل بداعتقاد کے کوئی شخص قائل نہیں ہوسکتا۔ آیت مسطور بالا کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اپنے مال یعنی گھوڑوں کا شاہی طریق پر معائنہ کیا۔ جس سے مقصود یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت عظمیٰ کا شکریہ ادا کریں۔ گھوڑے

سامنے سے گذرا گئے ۔اور ایک طرف سے گذر کر دوسری طرف آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے تھے۔آپ نے دوبارہ اسی طریق پر ان کی واپسی کا حکم دیا چنانچہ آپ نہایت شفقت اور پیار کی وجہ سے جیسا مالکوں کا قاعدہ ہوتا ہے ان کی ٹانگوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیر دیتے اور خوش ہوتے۔آیت کے الفاظ مذکورہ بالا سے اعتراض کی ہرگز تائید نہیں ہوتی۔بات صرف یہ ہے کہ لفظ تورات کا ضمیر بعض نے آفتاب کی طرف پھیر لیا ہے جو پہلے کہیں مذکور نہیں ہوا اور مسحا بالسوق والاعناق سے تلوار کے ساتھ ان کی گردنیں مار دینے کا مفہوم اخذ کیا ہے۔مگر ایسا مجنونانہ فعل ایک بادشاہ کی طرف جو نبی مرسل ہو منسوب کرنا سراسر غلطی ہے۔کیونکہ بلاوجہ مال کا تلف کرنا کسی عاقل کا کام نہیں بلکہ شرعاً گناہ ہے اور اگر الفاظ عن ذکر ربی کو عام وظائف اور نافلہ پر محمول کیا جائے تو بھی مطلب صاف ہے کہ آپ کو گھوڑوں کے معاملہ میں نوافل سے سہو ہو گیا۔پھر صورت صلوۃ العصر کے فوت ہو جانے کا خیال نہ تو کتاب اللہ میں مذکور ہے اور نہ کسی حدیث صحیح میں۔اس لئے ہم کسی ایسے اعتراض کو ہرگز صحیح نہیں تسلیم کرتے جو کتاب اللہ اور سنت سے اخذ نہیں ہو سکتا۔

جناب ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

غیر مذاہب کے بعض معترضین نے گاہ وبیگاہ جناب پیغمبر علیہ السلام کی نسبت بھی چند ایک مطاعن تراشے ہیں جن کی نہ تو کوئی اصل ہے اور نہ کوئی دلیل جس سے ان کے خیال باطل کی تصدیق ہو سکے۔صرف بعض ایسی روایات کی بنا پر جو اصول روایت کے رو سے کبھی پایہ صحت کو نہیں پہنچ سکتیں معاندانہ یا حاسدانہ پہلو میں نکتہ چینی کی ہے اگر یہ لوگ انصاف اور راستی سے کام لیتے تو انہیں اس قسم کے بیہودہ خیالات کے اظہار کا کبھی موقعہ نہ ملتا نہایت تعجب کا مقام ہے کہ یہ لوگ ایک ایسی مقدس ہستی کی طرف جس کی عصمت وعفت پر صدہا دلائل قطعیہ موجود ہیں کیونکر ایسے امور کی نسبت کر دیا کرتے ہیں جو انبیاء تو انبیاء دیگر عام بزرگان مذہب کی طرف بھی نسبت نہیں کئے جا سکتے۔خدا تعصب کا ستیاناس کرے جو انسان کو حق اور باطل میں امتیاز کرنے سے اندھا کر دیتا ہے۔

کرا رسد کہ کند عیب دامن پاکت ـ کہ ہمچو قطرہ کہ بر برگ گل چکد پاکی

(۱) منجملہ مطاعن کاذبہ کے ایک طعن وہ ہے جو نکاح زینبؓ کے متعلق بعض عیسائی مشنری پیش کیا کرتے ہیں جس کا ذکر سورۂ احزاب میں آ چکا ہے اور جس کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ زینبؓ کا نکاح جو آپ کی پھوپھی کی بیٹی تھیں آپ نے زیدؓ بن حارثہ سے جو آپ کا متبنی یعنی منہ بولا بیٹا تھا کر دیا تھا۔آپ کسی ضرورت سے زینبؓ کے

گھر تشریف لے گئے اور آپ کی نگاہ زینبؓ پر پڑی اور آپ نے اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر فرمایا سبحان اللہ مقلب القلوب ۔اور آپ کے دل میں زینبؓ کی محبت جاگزین ہوگئی اور دل میں اس کے ساتھ نکاح کرنے کا خیال پیدا ہوگیا۔ چنانچہ آپ نے بالآخر اس سے نکاح کرلیا اور یہ امر منصب نبوت کے لئے ہرگز شایان شان نہیں ۔سو یہ ہے اعتراض کی صورت ۔

اس اعتراض کا جواب جو محض معترض کی کج فہمی کا نتیجہ ہے خود الفاظ قرآن سے واضح ہو رہا ہے کیونکہ زینبؓ اپنے حسب ونسب میں خاندان قریش میں ایک ممتاز عورت تھی اور زیدؓ ایک آزاد شدہ غلام تھے اس لئے ہر دو میں ہمیشہ گھر میں کچھ نہ کچھ کشمکش رہا کرتی اور زیدؓ اس امر کا اظہار جناب پیغمبر علیہ السلام کی خدمت میں کیا کرتے ۔کچھ عرصہ ایسا ہوتا رہا اور آپ زیدؓ کو ہمیشہ باہمی اتفاق اور محبت سے رہنے کی فہمایش کیا کرتے ۔مگر باینہمہ ہر دو میں موافقت کی صورت پیدا نہ ہوسکی ۔آخر زیدؓ نے تنگ آکر دل میں زینبؓ کو طلاق دیدینے کا عزم کرلیا جس پر آپ نے انہیں روکا جس پر یہ الفاظ قرآنیہ امسک علیک زوجک واتق اللہ شاہد ہیں ۔آپ کو اللہ تبارک وتعالی کی طرف سے اس امر پر آگاہ کردیا گیا تھا کہ زیدؓ طلاق دے کر رہینگے ۔اور آپ زینبؓ کو اپنے نکاح میں لائینگے ۔مگر آپ لوگوں کے اس طعن وتشنیع کے خیال پر کہ اپنے متبنی کی بیوی کو اپنے نکاح میں لے لیا ہے ۔جس کا رواج اہل جاہلیت میں نہیں تھا دل ہی دل میں ارادہ نکاح کے اظہار سے اپنے تئیں روکا کئے ۔چونکہ یہ امر خدائے تعالی کو ناپسند تھا اس لئے بطور عتاب آپ کو بدیں الفاظ وحی ہوئی ۔وتخفی فی نفسک ماالله مبديه وتخشى الناس والله احق ان تخشاه ۔یعنی تم اپنے دل میں اس چیز کو مخفی رکھے ہو جس کو بالآخر اللہ تعالی ظاہر کرکے رہیگا اور تم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ خدائے تعالی سے ڈرنا کہیں زیادہ اولی اور اہم ہے ۔چنانچہ اس عتاب پر حضور علیہ السلام نے زیدؓ کے طلاق دیدینے کے بعد ایام عدت گذرنے پر ارادہ نکاح کا اظہار کردیا ۔اور مصلحت بھی اسی میں تھی کہ آپ زینبؓ کو نکاح میں لے لیتے کیونکہ اس کے مطلقہ ہوجانے پر آپ کو اس کی عصمت وعفت اور بارمعیشت کا خیال اہم نظر آتا تھا اور بجز نکاح کے کوئی اور چارہ نظر نہیں آتا تھا ۔مع ہذا اس نکاح میں بڑی بھاری مصلحت یہ تھی کہ متبنی کی بیوی سے نکاح کرنے کا حکم شریعت اسلامی میں منجملہ ایک قانون شرعی کے قرار پائے اور خود نبی اللہ سب سے پہلے بحکم وانا اول المسلمین اس حکم کی تعمیل کرے ۔تاکہ آئندہ کسی کو ایسے نکاح پر طعن وتشنیع کا موقعہ نہ رہے ۔امام زین العابدین علی بن حسین رضی اللہ عنہما کی ایک صحیح روایت میں یہی مروی ہے ۔بتلایئے اس میں ایک نبی اللہ کی شان کے منافی کون سی بات پائی

جاتی ہے؟ کیا معاذ اللہ آپ نے کسی فعل ممنوع کا ارادہ کیا تھا۔ جس پر مخالفین کو ایک بیہودہ وہم کرنے کا موقعہ ملا۔ حضرت ام المؤمنین عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور علیہ السلام اگر قرآن کے کسی حصہ کو امت سے مخفی رکھتے تو سب سے زیادہ مخفی رکھنے کے قابل یہی آیت تھی۔ دیکھئے اس قول سے کس حد تک حضور علیہ السلام کی صداقت کا پتہ چلتا ہے! کیونکہ اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ حضور علیہ السلام کو اپنے دل میں دو مشکلوں کا سامنا نظر آ رہا تھا۔ ادھر تو عوام الناس کے طعن کا خیال اور ادھر حکم خداوندی کی اطاعت۔ کیا مخالف کا یہ خیال کسی صورت میں بھی صحیح ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ نے زینبؓ کے حسن وجمال پر فریفتہ ہوکر اس کی محبت کا خیال اپنے دل میں بٹھلا لیا تھا کیونکہ اس صورت میں آیہ مذکورہ بالا کے یہ معنی ہوں گے کہ تم اپنے دل میں زینبؓ کی محبت چھپائے بیٹھے ہو۔ اور اللہ تعالی اس کو ظاہر کرکے رہیگا جس کا مطلب یہ ہے کہ معاذ اللہ تم نے زینبؓ کے متعلق ایک ناجائز خیال اپنے دل میں پیدا کرلیا ہے مگر خدائے تعالی تجھے رسوا کرکے رہیگا۔ مگر کیا کوئی عقل وہوش کا آدمی یہ باور کرسکتا ہے کہ خدائے تعالی ایک نبی اللہ کو جس کی معصومیت پر ہزاروں دلائل موجود ہیں یوں خطاب کرے اور یہ خیال صحیح بھی کیسے ہوسکتا ہے کیونکہ زینبؓ آپ کی پھوپھی کی بیٹی تھیں اور لڑکپن سے آپ اسے دیکھا کئے اور وہ آپ کو دیکھا کرتی۔ مگر مذکورہ بالا روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا زینبؓ کو دیکھنا بالکل پہلی بار واقعہ ہوا۔ جس سے آپ نے اس کے حسن وجمال کا اندازہ لگایا اور اگر یہ خیال صحیح مانا جائے تو سوال یہ پیدا ہوگا کہ آپ نے پہلے ہی زینبؓ سے نکاح کیوں نہ کرلیا تھا؟ زید کے ساتھ نکاح کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور پھر ہر دو کی ناچاقی پر آپ کا زیدؓ کو بار بار مصالحت وموافقت کی تلقین فرمانا کیا معنی رکھتا ہے؟ اور اگر بالفرض ہم روایت مذکورہ بالا کو درست بھی تسلیم کرلیں تو ناگہاں کسی اجنبی عورت پر نظر پڑ جانے سے اس کے حسن وجمال کا خیال دل میں پیدا ہونا کسی ارادی حالت کے ذیل میں نہیں آ سکتا بلکہ یہ ایک طبعی امر ہے۔ ہاں اس صورت میں یہ امر واقعی قابل اعتراض ہوسکتا ہے جبکہ اس خیال کے ساتھ کسی امر ممنوع کی طرف میلان ہوجائے بلکہ اس روایت سے تو صاف معلوم ہورہا ہے کہ آپ بجرد دیکھنے کے کلمہ سبحان اللہ زبان پر لائے اور واپس تشریف لے گئے۔ صرف اتنی ہی بات سے مخالف کا ایک ظن فاسد کچھ وقعت نہیں رکھتا۔

(۲) مخالفین آیہ واستغفر لذنبک وللمؤمنین والمؤمنات سے حضور علیہ السلام کے ارتکاب ذنوب کا مفہوم اخذ کیا کرتے ہیں حالانکہ اس آیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سراپا رحمت ہونے کا مفہوم مترشح ہوتا ہے مگر مخالفین کی کج فہمی انہیں غیر مقصود معنی کی طرف متوجہ کرتی ہے مگر یہ لوگ ہیں بھی

معذور کیونکہ قرآن مجید کے معانی دقیقہ تک ان کے عقول ناقصہ کو رسائی حاصل نہیں اور نہ ہی یہ لوگ قرآن مجید کے طرز بیان سے آگاہ ہیں۔اس آیہ شریفہ سے حضور علیہ السلام کے استغفار کے یہ معنی نہیں کہ آپ کسی قسم کے گناہ کے مرتکب ہوئے کیونکہ لفظ ذنب کی حقیقت تمام افراد انسانی کی طرف یکساں طور پر منسوب نہیں ہوسکتی۔عربی زبان کا ماہر اس امر کو بخوبی جانتا ہے کہ ایک لفظ کسی خاص مقام پر ایک خاص مفہوم پر مشتمل ہوتا ہے اور دوسرے مقام پر کسی دوسرے مفہوم پر۔دیکھو لفظ فرح آیہ فرح فخور میں مقام مذمت میں مستعمل ہوا ہے مگر آیہ فبذلک فلیفرحوا میں وہی لفظ مفہوم مدح کی طرف اشارہ کرتا ہے۔یہی حال لفظ ذنب کا ہے ۔جب اس کا ذکر عوام الناس کے لئے ہوگا تو اس میں ہر ایک قسم کے ذنب کا مفہوم پایا جائیگا مگر انبیاء علیہم السلام کی طرف یہ معنی منسوب نہیں کئے جاسکتے۔اس آیت میں لفظ ذنب سے حضور علیہ السلام کی وہ حالت قلبی مراد ہے جو رجوع الی اللہ کی حالت کے علاوہ تلقین وتبلیغ احکام اور جماعت مسلمین کے حالات کی نگرانی اور انتظام میں پیش آیا کرتی تھی۔چنانچہ ایک حدیث میں وارد ہوا ہے انہ لیغان علی قلبی حتی استغفر فی الیوم مائة مرة یعنی میرے دل پر ایک نہایت خفیف پردہ چھا جاتا ہے حتی کہ میں ایک دن میں سو بار استغفار کرتا ہوں ان الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے حالات متبدل ہوتے رہتے ہیں۔ایک حال تو وہ ہے جس میں غیر اللہ بالکل فانی اور محو نظر آتا ہے اور ایک دوسرے حال میں دیگر انسانوں کی طرح حجاب میں آجاتے ہیں۔مگر اس حقیقت کے سمجھنے کے لئے کسی صاحب مقام ہستی کی ضرورت ہے۔نفوس خبیثہ اس حقیقت کو کیا سمجھیں۔ایک نبی اللہ کے منصب نبوت کے غیر اللہ کی طرف رجوع کرنا ایک قسم کا ذنب ہی خیال کیا جاتا ہے۔کسی ایک بزرگ کے اس قول..... وجودک ذنب الله لایقاس به ذنب ..... میں اسی مذکورہ بالا حالت رجوع الی غیر اللہ کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے اور یہ حال تمام حضرات انبیاء واولیاء کے لئے یکساں طور پر معہود ہے چونکہ منصب نبوت کے لئے ایسی حالت کا پیش آنا کسی حد تک رجوع الی اللہ کی حالت سے مانع ہوتا ہے۔اس لئے اظہار عبودیت کے مقام میں استغفار ایک امر لازم ہے مگر عامة الناس کے حق میں اس قسم کے حالات لفظ ذنب کے مفہوم میں داخل نہیں۔اس جملہ مشہورہ کے معنی میں غور کرو۔حسنات الابرار سیئات المقربین۔یعنی نیک لوگوں کی نیکیاں ان لوگوں کے حق میں جو مقرب بارگاہ ہیں گناہ سمجھی جاتی ہیں ۔میرے خیال میں معترض اگر کچھ بھی انصاف اور راستی سے کام لیتا تو ایک آن کے لئے بھی اس قسم کا بیہودہ وسوسہ اس کے دل میں پیدا نہ ہوتا۔

مذکورہ بالا اعتراض کا جواب یوں بھی دیا کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کی ذات اقدس بموجب نص لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوہ حسنۃ امت مرحومہ کے لئے ہر ایک امر میں کامل نمونہ اخلاق وآداب شرعیہ کا تسلیم کی گئی ہے اور جب تک بحکم وانا اول المسلمین خود کسی حکم کی پابندی کر کے عملی نمونہ نہ پیش کرتے امت مرحومہ کو اس پر عمل کرنے کا صحیح موقعہ ہرگز پیش نہ آتا۔ چنانچہ اس حکم استغفار میں بھی حضور علیہ السلام کو نمونہ بن کر اپنے تئیں امت کے سامنے پیش کرنا ضروری تھا تا کہ افراد امت بھی ہمیشہ کثرت استغفار کے پابند رہیں گویا آپ کے عمل سے اس حکم کی تلقین امت مرحومہ کو کی گئی ہے نہ کہ آپ ﷺ کو۔ کیونکہ آپ مغفور ومرحوم ہیں اور یہ وہی معنی ہیں جو آیہ لاتکن من الغافلین میں مدنظر رکھے گئے ہیں حالانکہ صاف ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کبھی غفلت کے مرتکب نہیں ہوئے یا دوسری جگہ کم ہوتا ہے ولا تطع منھم آثما او کفورا حالانکہ آپ نے کبھی کسی آثم اور کفور کی کوئی بات نہیں مانی۔ بہرصورت مذکورہ بالا اعتراض کی بنیاد محض ایک زعم باطل پر ہے جس کی تائید کسی آیہ قرآنی سے نہیں ہوتی۔ یہی جواب سورۂ فتح آیہ لیغفرلک اللہ ماتقدم من ذنبک وما تاخر کا سمجھو واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

بعض مخالفین نے حضور علیہ السلام کے متعلق ایک اعتراض یہ بھی کیا ہے کہ آپ نے سورۂ نجم میں لات وعزی وغیرہ بتوں کی مذمت کرتے وقت بتوں کی تعریف میں یہ دو جملے بھی زبان سے پڑھ دیئے تھے۔

تلک الغرانیق العلی . ان شفاعتھن لترتجی

غرانیق غرنوق کا صیغہ جمع ہے جس کے معنی ایک دراز گردن سیاہ رنگ آبی جانور کے ہیں بعض نے اس کے معنی کلنگ کے لکھے ہیں مگر یہاں غرانیق کے لفظ سے تشبیہا بت مراد لئے گئے ہیں جن کو مشرکین پوجا کرتے تھے ان ہر دو جملوں کا مطلب یہ ہے کہ یہ بت جو بڑے بلند ہیں خدا کے سامنے ان کے پوجنے والوں کے لئے ان کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے۔ جب حضور علیہ السلام یہ ہر دو جملہ پڑھ چکے تو بعد میں بذریعہ وحی آپ کو اس غلطی پر آگاہ کیا گیا جس پر سورۂ حج کی آیہ وماارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطان فی امنیتہ الخ۔ نازل ہوئی۔ یعنی تجھ سے پہلے ہم نے کوئی رسول یا نبی نہیں بھیجا جس کے تلاوت کے وقت شیطان نے القانہ کیا ہو۔ معترض اس آیت سے یہ مفہوم پیدا کرتا ہے کہ حضور علیہ السلام پہلے دو جملوں کے بعد اپنی غلطی پر آگاہ ہوئے اور پچھتائے جس پر آیہ مذکورہ بالا شاہد ہے اور جس سے آپ کا قرآن مجید میں سہواً یا عمداً تصرف کرنا ثابت ہوتا ہے۔

یہ ہے حاصلِ اعتراض.....اس کا جواب مفسرین نے کئی ایک طرح پر دیا ہے مگر سب سے صحیح اور قوی جواب یہ ہے کہ یہ قصہ سراسر لغو اور باطل ہے اور ملاحدہ کا گھڑا ہوا ہے۔حدیث کی کتب معتبرہ میں کہیں اس کی کچھ اصل نہیں۔ابن کلبی اس قصہ کا راوی ہے جو فن روایت میں نہایت ضعیف اور غیر معتبر تسلیم کیا گیا ہے۔تعجب ہے کہ سورۂ نجم کے شروع ہی میں آیہ وماینطق عن الھوی آ چکی ہے جس کا معنی یہ ہے کہ پیغمبر خدا اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتے۔اور پھر بتوں کی مذمت اگلی آیات میں بدستور موجود ہے اور قرآن مجید خود شاہد ہے لایاتیہ الباطل من بین یدیہ و لا من خلفہ یعنی قرآن مجید میں نہ اب نہ بعد میں کبھی باطل کو دخل پھر کوئی عقل مند کیسے تسلیم کرسکتا ہے کہ پیغمبر خدا جو عمر بھر باطل معبودوں کی مذمت وتکذیب فرماتے رہے مذکورہ بالا دونوں جملوں کو تبلیغ کے مقام میں ارشاد فرماتے۔ان ھذا الابھتان عظیم۔بہرصورت حضرات مفسرین نے اس اعتراض کی کوئی اصل قرار نہیں دی کیونکہ قرآن مجید خود اس کی تکذیب کے لئے شاہد عدل ہے۔بخوف طوالت ہم نے دیگر بعض جوابات کا قلمبند کرنا مناسب خیال نہیں کیا۔وآخر دعوانا عن الحمد للہ رب العالمین.....

حواشی

۱۔حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد محض بطور انکسار نفس تھا۔۱۲منہ

۲۔سید احمد خان لکھتے ہیں کہ علماء نے آیہ فالتقمہ الحوت یونس کو مچھلی نگل گئی) کا مطلب غلط سمجھا ہے کیونکہ آیت کا مطلب صرف یہ ہے کہ مچھلی نے یونس علیہ السلام کو لقمہ بنا کر منہ میں لے لیا۔آپ کا مچھلی کے پیٹ میں جانا ثابت نہیں ہوتا۔ہم کہتے ہیں کہ حضرت یہ خیال آپ کی زبردستی ہے۔مگر ہم خوب سمجھتے ہیں کہ آپ کے لئے معجزات کے انکار پر تاویلات رکیکہ وبارد سے کام لینا اور لفظ ومعنی میں تحریف کرنا ضروری ہے آخر اپنے متبعین کو مطمئن کرنا بھی تو آپ کا فرض تھا۔التقم کے معنی جو آپ نے کئے ہیں غلط ہیں التقام کے معنے لقمہ کو گلے سے نیچے اتار لینے کے ہیں نہ صرف لقمہ کو منہ میں لے لینے کے۔عربی لغت بھی علما نے اپنے گھر سے بنالی تھی ۱۲منہ.....دیکھو منتہی الب التقام فروخوردن لقمہ را۔

۳۔وھل اتک نباء الخصم اذتسوروا المحراب الخ۔۱۲منہ